ڈاکٹر سائرہ بتول*

سر سیّد کے تعلیمی نظریات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

Abstract: *Post-colonial study of Sir Syed Ahmad Khan's educational ideologies is categorically the study of weight and value of Sir Syed Ahmad Khan's movement and its impact on the Muslims of subcontinent. Sir Syed Ahmad Khan was of the view that British rule will never end, hence Muslims of India must choose their path to survive unlike the Muslims of Spain. He was well aware of the strategies of British government about Indian Muslims, that is why he decided to save their identity from being demolished. In order for making them the best obedient citizens of British government he established unique, quick and sophisticated ways of educating Muslims. However, if that is the case a big unanswered question comes to the mind that what if British rule ever ends? What, then, could possibly be the shape and structure of his ideologies? How Muslims will cope with the new post-colonial situation of the territory especially in case of their own independent state. Study suggests that Sir Syed Ahmad Khan's educational ideologies were transformed into some unexpected legacies and went absurd. However, his scholastic approaches and modern thoughts were silently transferred to a few modern Muslim thinkers and then to some of the future Pakistani generations.*

سر سید کا زمانہ نو آبادیات کا زمانہ ہے۔ مابعد نو آبادیات کا زمانہ ظاہر ہے اُس کے بعد والا زمانہ ہے۔ جہاں نو آبادیات کو استعماریت کہا جاتا ہے وہاں مابعد نو آبادیات کو لا محالہ مابعد استعماریت ہی کہا جائے گا۔ یعنی استعماریت سے چھٹکارے کا دور۔ یہ کون سا دور ہے؟ دراصل استعماریت کا آغاز اگر ہیلن آف ٹرائے سے ہوتا ہے تو مابعد استعماریت کا آغاز یقیناً اس وقت کو کہا جائے گا جب دنیا سے کشور کشائی کا عملاً خاتمہ ہو گیا۔ غالباً یہ دوسری جنگِ عظیم ہے جس کے بعد سے کسی ملک نے کسی دوسرے ملک پر ہمیشہ کے لیے زمینی قبضہ نہیں کیا، بلکہ پرانے قبضوں میں سے بھی اکثر ایک ایک کر کے چھوڑ دیے گئے۔ چنانچہ مابعد نو آبادیات کا صحیح آغاز تو دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مابعد نو آبادیات کے عہد میں سر سید کے تعلیمی نظریات کے اثرات کیونکر اور کیا مرتب ہوئے؟ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ سر سید کے تعلیمی نظریات فقط برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت سدھارنے پر مشتمل ہیں تو ہم مابعد نو آبادیاتی عہد میں

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو (خواتین)، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد۔

سر سید کے اثرات بھی انہی خطوط پر ہی دیکھنے کی کوشش کرینگے یعنی بر صغیر کے مسلمانوں کے روشن یا تاریک مستقبل کی صورت میں۔یوں دراصل ہمیں ایک تاریخی عمل کے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے ایک اور خاص تاریخی عمل کی اہمیت کا جائزہ لینا ہے۔اس بات کے خاطر خواہ ثبوت موجود ہیں کہ آخر الامر سر سید فقط بر صغیر کے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے نہ کہ تمام اہلِ ہند کو۔یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ سر سیّد ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز حکومت کا اطاعت گزار شہری بنانے میں مسلم قومیت کی شناخت کی بقا کا منظر دیکھتے تھے۔وہ اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ انگریز بر صغیر سے جانے والے نہیں ہیں۔۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی ناکام ہوئی اور بغاوت کا سارا الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا گیا تھا۔انگریزی سرکار مسلمانوں کو اپنا بدترین دشمن تصور کرنے لگی اور بعض برطانوی افسروں میں ایک باقاعدہ ذہنیت پیدا ہو گئی جو مسلمانوں کو ہندوستان سے مکمل طور پر فنا کر دینے کے حق میں رائے دینے سے بھی نہ چوکتی۔دنیا کے سامنے ایک مثال تو پہلے موجود تھی ہی کہ سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں، اگرچہ اندلس کے سابق حکمران مسلمان تھے لیکن مفتوح ہونے کے بعد اندلس سے مسلمانوں کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا۔(۱)

سر سیّد کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ ہندوستان کے مسلمان اگر اپنی شناخت قائم رکھ سکتے ہیں تو فقط اچھے اور اطاعت گزار شہری بن کر، نہ کہ بغاوت کا راستہ اختیار کر کے۔سر سید کے خیال میں ایسی اچھی رعایا بننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے حکمرانوں کی زبان، ان کے رہن سہن، رکھ رکھاؤ اور ان کے علوم فنون سے اچھی طرح واقف ہوں۔سر سید کا یہ خیال کہ اس طرح مسلمان قوم کی شناخت محفوظ ہو جائے گی، اتنا غیر منطقی بھی نہیں تھا کیونکہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا قومی شناخت کی بقا کا خواب قیام پاکستان کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا جو بہر حال علیگڑھ تحریک کے سرچشمے سے ہی پھوٹنے والا جوالا مکھی تھا۔ سر سید ہندوستان کے مسلمانوں کو فنا ہونے سے بچانے کا واحد حل یہی سمجھتے تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں۔وہ چاہتے تھے کہ جدید مغربی علوم وفنون جو کہ انگریزی تعلیم کے ذریعے ہی حاصل کیے جاسکتے تھے مسلمانوں کو سیاسی ترقی اور معاشرتی سربلندی بخشیں گے۔ان سب کے علاوہ چونکہ سر سید مسلم قومیت کے بقا کی جنگ لڑ رہے تھے چنانچہ جونہی انھیں اندازہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی الگ شناخت کے لیے ان کی زبان "اُردو" ایک مشترکہ پہچان کا درجہ رکھتی ہے تو وہ جہاں مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی تلقین کر رہے تھے وہیں اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے نہ صرف کوشاں تھے بلکہ مستقبل میں ترقی یافتہ ہندوستانی مسلمانوں کو اردو کی زنجیر میں یکجا دیکھنے کے خواہشمند بھی تھے۔

ڈاکٹر انور سدید (۲۰۰۴) سر سید کی تعلیمی تحریک کے مقاصد کو تین سطحات میں تقسیم کرتے ہیں :

> "اوّل۔سیاسی زاویہ۔مسلمانوں کی تہذیبی بقا۔سیاسی ترقی اور معاشرتی سربلندی دوم۔مذہبی زاویہ۔نئے علوم کی روشنی میں دینِ فطرت کی توضیح و تشریح اور اوہام پرستی کا ازالہ سوم۔ادبی زاویہ۔اردو زبان و ادب کا فروغ"(۲)

غرض سرسید کے تعلیمی نظریات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ہمیں از خود اقبال اور پاکستان کی صورت پروان چڑھنے والے اثرات سے ہوتا ہوا عہدِ حاضر میں عالمِ اسلام کی عالمگیر علمی تشنگی تک لے آتا ہے۔ اگرچہ مابعد نو آبادیاتی عہد کو بھی بیشتر مؤرخین سماجیات ایک نئے طرز کی نو آبادیات کی صورت ہی میں دیکھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ بلاشبہ زمینی فتوحات کا دور بظاہر لد گیا لیکن نو آبادیات ابھی ختم نہیں ہوئی جیسا کہ فی زمانہ بہت سے ممالک کسی حد تک امریکی نو آبادیات کی نمائندگی کرتے ہیں، ایک اور نکتۂ نگاہ سے درست خیال تسلیم کیا جاتا ہے۔ استعمار نے ، استعمارزدہ کو یا ایڈورڈ سعید (۱۹۹۴) کے الفاظ میں، ''بالادست نے زیردست'' کو جدید ہتھکنڈوں سے مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی ویسے ہی رشتے میں باندھ کر رکھا جو رشتہ ان دونوں طبقات کے درمیان روِاؤل سے قائم تھا (۳) ۔ اردو میں نو آبادیات کی خاصی تفصیل اشفاق سلیم مرزا (۲۰۱۱) کی کتاب ' فلسفۂ تاریخ نو آبادیات اور جمہوریت'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات کہ نو آبادیات نے بتدریج کئی شکلیں اختیار کی ہیں جن میں اب داخلی نو آبادیاتی نظام بھی شامل ہے اگرچہ غیر درست نہیں لیکن ہمارے زیر نظر مقالے کے موضوع سے خارج ہے۔ تاہم، ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ نئی طرز کی داخلی نو آبادیات جسے لامحالہ مابعد نو آبادیات ہی کہا جائے گا سرسید کے نظریات سے مستحکم ہوئی یا کمزور؟ کیونکہ انڈین نیشنل کانگریس نے سرسید کی جس پیرائے میں ہمیشہ مخالفت کی وہ یہ تھا کہ '' سرسید کی تعلیمات طبقاتی نظام کے خلاف کسی قسم کی جدوجہد تو ہے نہیں البتہ کسی نہ کسی درجے میں اس فرق کو مزید مستحکم کرتی ہے جو بالادست اور زیردست کے درمیان قائم ہے۔ اور سرسید کا یہ قیاس کہ ہندوستانی مسلمانوں کی شناخت کو باقی رکھنے کا خواب دیکھا جا سکتا ہے تو فقط جدید علوم، سائنس، مغرب میں ہونے والی ترقی، ٹیکنالوجی اور سب سے بڑھ کر فنون، ادب اور آدابِ حیات میں قدامت پرستانہ روش کو ترک کر کے ہی دیکھا جا سکتا ہے، اس لیے ناقابلِ عمل ہے کہ ہندوستان تہذیبی اعتبار سے سراسر مختلف سرزمین ہے، بالفاظِ دیگر ہندوستانی سب ایک جیسے ہیں۔ بعد ازاں کانگریس کا یہی خیال اور سرسید کا تعلیمی ترقی کا خواب تحریکِ پاکستان کی صورت میں زیادہ واضح ہو کر صفحاتِ تاریخ میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس نکتۂ نظر سے بھی سرسید کے تعلیمی نظریات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ نہ ہی ہم سرسید کے اثرات کو موجودہ ہندوستانی مسلمانوں یا بنگلہ دیش میں مقیم مسلمانوں کی ساخت اور حالت کے حوالے سے زیر بحث لائیں گے۔ اس مضمون میں ہماری تحقیق فقط پاکستان کے اندر سرسید کے افکارِ تعلیم کے اطلاق اور اس کی حالتِ زار کے جائزہ تک محدود ہے۔ اسی طرح اس مطالعہ کے دوران ہم ان خطرات سے صرفِ نظر بھی نہیں کر سکتے جو اسلام کی قدیم تشکیلات کو لاحق تھے۔ خود سرسید احمد خان کو اس بات کا ادراک تھا اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ مثلاً جب سرسید نے قران کی تفسیر لکھی تو ان کے بنیادی مقاصد میں یہ شامل تھا کہ یہ تفسیر اہلِ مغرب کو اسلام کے بارے میں موجود ہر بدگمانی کا جواب دینے کے لیے کافی ہو گی۔ گویا سرسید قران کی تفسیر کر رہے تھے تو ایسے علم الکلام کی مدد سے جو خدا کی وحدانیت سے لے کر بہشت و دوزخ تک تمام تر عقائد کی تفہیم کو بیخ و بن سے ہلا دینے والا تھا۔ کیا آنے والے دور کے مسلمانوں کو یہ جدت قبول ہوتی؟ چنانچہ وہ اثرات جو جدید یا روشن خیال اسلام کی شکل میں ظاہر ہوئے، وقت کے ساتھ ان کے ایک حصے کو فطری طور پر الحاد کی شکل بھی اختیار کرنا تھی۔ سرسیّد خود اس قسم کی صورتحال سے واقف

تھے۔(۴)چنانچہ سرسید کے تعلیمی نظریات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بتدریج سرسید کے دور سے عہدِ حاضر تک کا سفر کرنا ہو گا۔

سلیم احمد نے اپنے ایک مضمون "گڈ بائے ٹُو سرسیّد" (۲۰۰۹) میں لکھا کہ سرسیّد کے عمل نے اُن کی نیت اور مقصد سے آزاد ہو کر وہ نتائج پیدا کیے جن کی ہمیں ایک وقت میں ضرورت تھی۔ ہم نے ان سے کام لیا اور اپنی ضرورت پوری کی۔ ہم نے جہاد کیا، ہم زندہ رہے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا۔ ہندوستان کی رُوح ہمیشہ سرسید کے پیدا کیے ہوئے سپاہیوں کی ممنون رہے گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ نتائج اب تک کیوں بر قرار ہیں؟

> "سرسید جو ہمارے لیے سنگِ میل تھے، اب سنگِ راہ ہیں۔ اب وہ راستے نہیں دکھاتے گمراہ کرتے ہیں۔ منزل رسی میں مدد نہیں دیتے، رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ تاریخ کا تقاضا ہے کہ اس سنگِ راہ کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس کی اپنی وقتی اور تاریخی اہمیت و ضرورت کا اعتراف کر کے اس کو ٹھوکر ماردی جائے۔ سرسیّد زندہ ہوتے تو مجھے حق الیقین ہے کہ جو لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں، ان کی تائید کرتے"(۵)

سرسیّد احمد خان کے تعلیمی مقاصد کے حوالے سے یہ تو طے ہے کہ اُن کے پیش نظر انگریز سرکار کی موجودگی کی صورت، مسلمانوں کی ترقی کا منصوبہ تھا نہ کہ ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کی صورت۔ سرسیّد احمد خان نے خود متعدد مقامات پر اس خیال کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی ایک اچھی رعایا بنانا چاہتے ہیں۔ سرسید کی تمام تر تحریک کو دو حصوں میں یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک حصہ جو انگریزوں کو یہ بتانے پر مشتمل ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی نسبت اُن کے زیادہ قریب ہیں کیونکہ مسلمان اہلِ کتاب ہیں اور یہ کہ مسلمانوں میں ایک اچھی رعایا بننے کی بہت صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ حکومت ان کی تعلیم کی طرف متوجہ ہو۔ جیسا کہ علیگڑھ کی افتتاحی تقریب کے موقع پر بیان کیے گئے، ادارے کے مقاصد میں واضح کر دیا گیا تھا کہ:

> "ہم کو اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو اتحاد ہوا ہے وہ مدت دراز تک قائم رہے گا۔ پس اپنے ہم وطنوں کے دلوں پر ان باتوں کا روشن کرنا اور ان کو اس پر تعلیم دینا کہ وہ ان برکتوں کی قدر شناسی کر سکیں اور زمانۂ سلف کے دھوکہ دینے والے خیالات کو باطل کرنا کہ جو ہماری ترقی کے مانع ہوتے ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کے لائق و کار آمد رعایا بنانا اور ان کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں؛ بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی اصلی قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے"(۶)

جب یہ ثابت ہو جائے کہ سرسیّد کے پیش نظر مقاصدِ تعلیم ہی انگریزی حکومت کے دوام کے ساتھ مشروط تھے تو لامحالہ مابعد نو آبادیاتی منظر نامہ ضرور مختلف ہو گا کہ جب انگریز چلے گئے اور اہلِ ہند آزاد ہو گئے تو سرسیّد کا مخصوص مقصدِ تعلیم نتائج کے اعتبار سے

کس سمت کو رُخ کرے گا اور اِس حقیقت سے انکار کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان اُسی دن وجود میں آ گیا تھا جب سر سیّد نے علیگڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ چنانچہ استخراجی نتیجہ اخذ ہوتا ہے تو یہ کہ "پاکستان ہی سر سیّد کے تعلیمی نظریات کی مابعد نو آبادیاتی شکل ہے"۔ لیکن یہ سوال کہ پاکستان کے بعد اُس مخصوص نوعیت کی تعلیم جو کہ انگریز کی رعایا بنانے کی غرض سے اختیار کی گئی تھی، کا کیا جواز رہ جاتا ہے، پوری شدت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتا ہے، جیسا کہ ہم نے سلیم احمد کی رائے میں بھی ملاحظہ کیا۔

حالی کے الفاظ میں،

> "سر سید نے برصغیر ہندوپاک میں لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم کو جس دلجمعی اور اخلاص سے متعارف کرانے کی کوشش کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، جیسا کہ آپ لارڈ میکالے صاحب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں: ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے؛ بلکہ دھوکہ میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ میکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس دھوکہ کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا"(۷)

غرض یہ سوال کہ پاکستان بننے کے بعد لارڈ میکالے کا وہ نظامِ تعلیم جسے بقول حالی، سر سید نے نہایت دلجمعی اور اخلاص سے متعارف کروانے کی کوشش کس قسم کے اہداف حاصل کرنے کا اہل تھا، بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اور اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں پاکستان میں رائج نظام ہائے تعلیم کا بغور جائزہ لینا ہو گا۔

ہم جانتے ہیں کہ پاکستان میں تین نظام ہائے تعلیم رائج ہیں۔

نمبر ۱۔ سرکاری نظامِ تعلیم

نمبر ۲۔ پرائیویٹ اسکولوں کا نظام

نمبر ۳۔ دینی مدارس کا نظام

ان میں سے پہلا یعنی سرکاری نظامِ تعلیم دراصل سر سید کا نظامِ تعلیم ہی ہے۔ دوسرا یعنی پرائیویٹ نظامِ تعلیم مختلف النوع قسم کے غیر ملکی نظام ہائے تعلیم کا مجموعہ ہے۔ جبکہ تیسرا یعنی دینی مدارس کا نظام، شروع دن سے ہی سر سید کے نظام تعلیم کے عین مخالف سمت میں واقع ایک قدیم نظام ہے جس کا بنیادی مقصد دین، مذہب اور شریعت کی تعلیم ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ سر سید کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جنہوں نے یورپی تہذیب کی مخالفت کی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سر سید احمد نے پوری قوت اور جوش و خروش کے ساتھ مسلمانوں کو یورپی علوم کے ساتھ ساتھ یورپی تہذیب اختیار کرنے کی بھی تبلیغ کی۔ اس خیال سے کہ ہندوستانی مسلمان سر سید کی روشن خیالی کو مسترد کر دیں گے، سر سید نے تہذیب الاخلاق میں ایک تواتر کے ساتھ مغربی ترقی اور

جدت پسندی کا سہرا اندلس کے مسلمانوں کے سر باندھنے کی بارہا کوشش بھی۔ اس قدر مبلغانہ جوش کے باوجود ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ سرسید کے نظامِ تعلیم میں نصاب کو بالکل ہی جداگانہ اہمیت حاصل ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کی سند سے روشن خیالی کے راستے پر گامزن کرنے کی ان تھک کوشش کی گئی ہے تو ہم سرسید کا شمار ان نو آبادیاتی ادیبوں میں بھی نہیں کرسکتے جو استعمار کاروں کی تہذیب کے فقط گن گاتے رہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ سرسید کے پیش نظر مقاصد ہی کچھ اور تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ مسلمانوں کو اپنے آثار اور اپنی تعلیمی روایت پر چلنے کی بجائے مغرب کی ترقی یافتہ تعلیمی و تحقیقی روایت پر چلانا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ مسلمانوں کو ان کی بنیادوں سے دُور بھی نہ کر دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے اپنی پوری فکری زندگی اسلامی عقائد، اقدار، شعائر، روایات اور اسناد کی جدید تشریحات کرنے کے لیے وقف کر دی۔

اتنی وضاحت کے بعد اب ہم یہ دیکھنے کے قابل ہو چکے ہیں کہ موجودہ پاکستان کے تین بڑے نظام ہائے تعلیم میں سے ایک تو سرسید کی فکری روایت کو لے کر آگے بڑھا جسے ہم پاکستان کے سرکاری سکولوں کا نظام کہتے ہیں۔ اگرچہ اس کا ظاہری ڈھانچہ لارڈ میکالے کے وقت سے مابعد نو آبادیاتی عہد تک کبھی تبدیل نہ کیا جاسکا لیکن پھر بھی وہ اپنے نصاب اور تدریسی روایت میں سرسید کا رائج کردہ نظامِ تعلیم ہی تھا۔ دوسرا اُس وقت یعنی سرسید کے عہد کے استعمار کی روایت کا امین ہُوا جسے ہم پرائیویٹ سکولوں کا نظام کہتے ہیں جبکہ تیسرا یعنی دینی مدارس کا نظام اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے معاشرے میں ویسا فعّال نہیں رہا جیسا سرسید کے زمانے میں تھا۔ البتہ یہ نظام ہمیشہ سرسید کے نظامِ تعلیم کا مخالف رہا۔ پرائیویٹ اسکولوں کا نظام کیوں نو آبادیاتی دور کے انگریزی اسکولوں جیسا ہے؟ اس کا جواب اس نظام میں رائج نصابوں میں نہایت آسانی سے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ یہ ایک معلوم سچائی ہے کہ پاکستان کے پرائیویٹ اسکولوں کے نصاب محاورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہیں کیونکہ ہر اسکول سسٹم کا الگ نصابِ تعلیم اور طریقۂ تدریس ہے۔ ان میں سے ہر اسکول سسٹم نے خود اپنے طور پر مختلف نصاب اختیار کر رکھے ہیں جن میں سے بعض آسٹریلین، بعض امریکن، بعض برطانوی اور بعض یورپ کے دیگر ممالک سے درآمد شدہ ہیں۔ پرائیویٹ اسکولوں کی متعدد قسمیں ہیں۔ ان میں غالب تعداد کے اسکول تو نہایت تنگ اور مختصر عمارتوں میں بنے ہوئے ہیں۔ سرسید تو سکولوں کے لیے نہایت کشادہ اور اعلیٰ عمارتوں کے قائل ہی نہ تھے بلکہ مبلغ تھے۔(۸)

اگرچہ سرکاری اسکولوں کا نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم سرسیّد اور لارڈ میکالے سے ماخوذ تھا لیکن اوّل دور کے ماہرین تعلیم نے اس میں خاطر خواہ تبدیلیاں کر کے اسے پاکستانی قوم کے لیے مرتب کر دیا تھا۔ یہی وجہ رہی کہ اوّل دور کے پاکستانیوں کی نشوونما قدرے مختلف طریقے سے ہوئی جبکہ اسّی کی دہائی میں درآنے والے غیر ملکی نظام اور نصاب ہائے تعلیم کی طغیانی نے ایک ایسی قوم پیدا کرنا شروع کر دی جس کا مطمع نظر اپنے پیشرو پاکستانیوں سے بہت حد تک مختلف تھا۔ یوں گویا پاکستان میں سرسید کے نظریات کی مدد سے مرتب کیا گیا تعلیمی ڈھانچہ وقت کے ساتھ ناکام ہو گیا اور اس کی جگہ متعدد بے جہت نظریات نے لے لی۔ اگر سرسید کے تعلیمی نظام کو ناکام ہونے سے بچایا جاتا تو "پاک سرزمین شاد باد" پڑھتے ہوئے جوان ہونے والے پاکستانیوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی اور پاکستانی قوم میں حب الوطنی کا جذبہ بھی ماضی کی نسبت ماند نہ پڑ گیا ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عین وہی دور جب سرکاری اسکولوں پر غیر ملکی نصابوں والے پرائیویٹ اسکولوں کا دبدبہ

قائم ہونا شروع ہوا، دراصل وہی دور ہے جب امریکہ اور روس کی سرد جنگ ہمارے پڑوس میں گرم جنگ کی صورت اختیار کر چکی تھی اور پاکستان کے دینی مدارس سے ہزاروں مجاہدین امریکہ کی جنگ لڑنے کے لیے جوق در جوق افغانستان جا رہے تھے۔ اُدھر غیر ملکی نصابوں کے حامل اسکولوں نے آبادی کے بڑے حصے سے پاکستانی قومیت اور حب الوطنی کا صفایا تو کر ہی دیا تھا۔ چنانچہ سرکاری اسکولوں کی ناکامی قومی شناخت سے محرومی کی طرف پیش قدمی ثابت ہوئی۔ یہاں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ وہی مسلم قومی شناخت تھی جس کی بقا کا خیال، سرسید کا فقط خواب ہی نہیں ایک جنون تھا اور اسی جنون نے سرسید کو ایک الگ نظامِ تعلیم تشکیل دینے پر اُکسایا تھا۔

سرسید کے تعلیمی نظام کے بعد اب ہم اگر سرسید کے نصابِ تعلیم کو عہدِ حاضر میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لگ بھگ وہی صورتحال یہاں بھی نظر آتی ہے۔ سرسید کا نصابِ تعلیم کیا تھا؟ جدید سائنس، غالب اقوام کی زبانیں سیکھنا، فلسفہ و حکمت کی اسلامی روایت کا احیا، قران کی تازہ تفہیم، عظیم اسلامی تہذیب و تاریخ سے آگاہی اور غلام قوموں جیسی عادات اختیار کرنے سے حتی المقدور اجتناب۔ سرسید کے مخاطبین یعنی ہندوستانی مسلمانوں کے تینوں بڑے گروہ جن میں پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے مسلمان شامل ہیں فی زمانہ سرسید کے نصابِ تعلیم سے موافق معلوم نہیں ہوتے۔

تیسرے نمبر پر ہمیں سرسید کی تعلیمات کا جائزہ لینا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں سرسید کی تعلیمات، افکار و عقائد البتہ کسی حد تک باقی رہے۔ علامہ اقبال تو نو آبادیاتی دور میں ہی وفات پا گئے اور یوں بھی علامہ اقبال کے افکار سرسید کے افکار کا تسلسل نہیں سمجھے جا سکتے کہ دونوں بنیادی طور پر مختلف راستوں سے مختلف نتائج تک پہنچنے والے مفکرین ہیں۔ اور یہ بات دونوں زعما کے متعدد افکار سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً سرسید انگریز سرکار کی رعایا کے طور پر مسلمانوں کو مذہبی رسومات کی ادائیگی کرتے ہوئے دیکھ کر مطمئن ہو جانا چاہتے ہیں جبکہ اقبال اس کے عین برعکس خیال کے مالک ہیں۔ حالی نے جہاد کے بارے میں سرسید کی رائے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں وہ شریعت اسلام کی رُو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت نہ اور کسی قسم کا فساد۔ ان کو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کے زیر حکومت اسی اطاعت و فرمانبرداری سے از روئے مذہب اسلام کے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ کے زیر حکومت رہے تھے"(۹)

جبکہ اقبال اس کے بالکل برعکس خیال کے مالک ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے کہ:

مُلّاں کو ہے جو ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

البتہ مابعد نو آبادیاتی عہد میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ عنایت اللہ المشرقی، غلام احمد پرویز اور فی زمانہ جاوید احمد غامدی جیسے مسلم مفکرین دراصل سرسید کے فکر و خیالات کی روایت کا ہی احیا ہیں۔ سرسید کو بھی اپنے وقت میں معتزلی کہہ کر پکارا گیا اور ایسے مفکرین کو

بھی معتزلی ہی کہا گیا جو اسلامی عقائد کی تشریحات جدید عصری علوم کی روشنی میں کرتے ہیں۔ علامہ عنایت المشرقی ڈارون کے نظریہ ارتقاً سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی تمام عمر تمکن فی الارض کی تگ و دمیں گزار دی۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاً کے تو علامہ اقبال بھی قائل تھے لیکن اقبال کے ساتھ تصوف کی جُڑت انہیں متقدمین کی صف سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ لیکن غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی جیسے مفکرین کے ہاں لگ بھگ تمام تر اسلامی عقائد کی تشریحات تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ سرسید احمد خان کی تشریحات سے ملتی جلتی ہیں۔ چونکہ سرسید کی تشریحات معتزلہ سے ملتی جلتی ہیں اس لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ مابعد نو آبادیاتی عہد کے بعض مسلم مفکرین معتزلہ کی روایت کے احیا کا موجب بننے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور یہ بات سرسید کے تناظر میں دیکھی جائے تو بلاشبہ مایوس کن نہیں ہے۔ لیکن سرسید خود اِس حقیقت سے واقف تھے کہ جس قسم کی تعلیم کے لیے وہ تگ و دو کر رہے ہیں، اس کا ایک نتیجہ الحاد یا دین سے بیزاری کی صورت بھی بر آمد ہو گا۔ حالی نے لکھا ہے کہ:

> "وہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں، خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان ہوں اور خواہ عیسائی، ان کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا، عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی" (۱۰)

سرسید اس صورتحال سے خود بھی کچھ زیادہ فکر مند نہیں تھے۔ وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے اور یہ سمجھتے تھے کہ: "جس مجموعۂ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا" (۱۱)۔ چنانچہ انگریزی علوم کو پھیلانے میں انہیں کوئی جھجک نہ تھی بلکہ اس کے برعکس سرسید کا یہ کہنا تھا کہ:

> "میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی، میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں بلکہ غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نُورانی چہرے پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی گئی ہیں" (۱۲)

سرسید انگریزی تعلیم کے اس پہلو سے واقف تھے کہ اس کے پھیلانے سے عام مذہب بیزاری بھی پھیلے گی لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایسی مذہب بیزاری دراصل مروجہ مذہب سے بیزاری ہو گی اور چونکہ مروجہ مذہب اصل مذہب کا نمائندہ نہیں چنانچہ ایسی مذہب بیزاری پیدا ہو جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس تناظر میں ہم جب مابعد نو آبادیاتی عہد کے تعلیم یافتہ مسلم آبادیوں بالخصوص پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقعہ مغربی تعلیم نے ماقبل نو آبادیاتی عہد کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی نسبت آج کے پڑھے لکھے مسلمانوں کو مذہب سے بیزار کیا ہے۔

ایک اور پہلُو جس کی طرف توجہ نہ کرنا موضوع کے ساتھ ناانصافی ہو گی یہ ہے کہ سرسید کے تعلیمی منصوبے اپنی ساخت میں خالصتاً مادی نوعیت کے تھے۔ قطع نظر اس امر کے کہ سرسید کے منصوبوں کا ایسا ہونا اُن کی خوبی تھی یا خامی، یہ طے ہے کہ اس کی وجوہات فقط دو تھیں:

اوّل۔ جس مغربی تعلیم کا اجرا سرسید ہندوستان میں کر چکے تھے، وہ خود مغرب میں بھی فقط مادیت کی تعلیم تھی ۔ دوم۔ سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی حالت بہتر کرنے کا واحد حل یہی سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی سرکار کی اچھی رعایا بن سکتے ہیں تو فقط حکومت میں اچھی ملازمتیں حاصل کر کے۔ شیخ اکرام (۱۹۹۵) کے بقول، علیگڑھ میں مادیت اور ظاہر پسندی کا دور دورہ تھا۔ اساتذہ میں علمی اہلیت اور فنی قابلیت تو ساری تھی، لیکن ان کی نگاہیں بلند نہ تھیں۔ انھوں نے دولت کے حصول کو علم کے حصول پر ترجیح دی۔ علم اور فن کو کمانے کا ذریعہ سمجھا۔ غرض "اُن کا منتہائے زندگی یہ ہو گیا کہ کسی طرح ظاہری ٹھاٹھ اور خوش معاشی میں وہ ایک سیکنڈ گریڈ ڈپٹی کلکٹر کا مقابلہ کر سکیں" (۱۳)

غرض سرسید احمد خان کے تعلیمی نظریات کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ ہمیں ان نتائج تک پہنچاتا ہے کہ اوّل تو سرسید کے مقاصد فقط نو آبادیاتی عہد کے مسلمانوں کی حالت سدھارنے تک محدود تھے اور یہ کہ مابعد نو آبادیاتی عہد میں ان مقاصد کا حصول کسی طور بھی مسلمانوں کا مطمعِ نظر نہیں رہا تھا۔ کیونکہ مابعد نو آبادیاتی عہد میں اب مسلمانوں کو انگریز سرکار کی اچھی رعایا بننے کی مزید ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ دوئم یہ کہ پاکستان میں سرسید کے نظامِ تعلیم کی ساخت بھی وہ نہ رہی جو علیگڑھ کے زمانے میں تشکیل پائی تھی اور تقسیم کے بعد کا پاکستان سرسید کی جدت پسندی کو من و عن قبول کرنے کے لیے کبھی بھی خود کو تیار نہ کر سکا۔ مزید یہ کہ سرسید کے جدت پسند دینی افکار تو کسی حد تک باقی رہے لیکن محض چند ایک مفکرین اور اُن کی تحریکوں کی صورت نہ کہ من حیث القوم تمام پاکستانی، ہندوستانی یا بنگلہ دیشی مسلمانوں میں۔ البتہ جن نتائج پر ہم پہنچے ہیں ان میں سب سے اہم یہ کہ سرسید مسلمان قوم کی جس شناخت کو باقی رکھنے کا خواب دیکھ چکے تھے، وہ پاکستان کی صورت میں ہی باقی رہی نہ کہ ہندوستان کے کسی اور حصے میں موجود مسلمانوں کی صورت میں۔

حوالہ جات:

۱۔ شہابی، انتظام اللہ مفتی، تاریخ ہسپانیہ سلاطینِ اندلس، کراچی: مکتبہ فریدی، ۱۹۵۶، ص:۱۵۷

۲۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۲۰۰۴، ص :۳۰۹

۳۔ نیّر، ناصر عباس ڈاکٹر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، کراچی: اوکسفورڈ، ۲۰۱۳، ص: ۱۹

۴۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید (جلد اوّل)، لاہور: سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، ۲۰۱۵، ص: ۱۴۳

۵۔ احمد، سلیم، "گڈ بائے ٹو سرسیّد" مشمولہ، مضامینِ سلیم احمد، مرتبہ؛ جمال یانی پتی، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹، ص:۲۹۰

۶۔ زبیری، محمد امین مولوی، تذکرہ سرسید، لاہور: یونائیٹڈ پبلشرز، ص:۶۵-۶۴

۷۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید، لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۶۶، ص:۴۰۲

۸۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید (جلد اوّل)، لاہور: سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، ۲۰۱۵، ص: ۱۳۸

۹۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید (جلد اوّل)، لاہور: سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، ۲۰۱۵، ص: ۱۲۰

۱۰۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید (جلد اوّل)، لاہور: سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، ۲۰۱۵، ص: ۱۴۳

۱۱۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید (جلد اوّل)، لاہور: سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، ۲۰۱۵، ص: ۱۴۴

۱۲۔ حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید (جلد اوّل)، لاہور: سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، ۲۰۱۵، ص: ۱۴۶

۱۳۔ اکرام، شیخ محمد، موجِ کوثر، راولپنڈی: سرو سز بک کلب، ۲۰۰۴، ص:۱۰۵۔